انسپکٹر سعید کے کارنامے

انسپکٹر سعید کے کارنامے

سعید لخت

تعلیم و تربیت

خُفیہ پولیس (سی آئی ڈی) کے انسپکٹر سعید نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی دلیری اور عقل مندی سے اپنے افسروں کا دِل جیت لیا تھا۔ شہر میں کوئی سنگین واردات ہوتی اور دوسرے پولیس انسپکٹر مُجرموں کا کھوج لگانے میں ناکام رہتے تو یہ فرض نوجوان انسپکٹر سعید کے سپرد کیا جاتا اور وہ چند ہی روز میں مجرموں کا سُراغ لگا کر انہیں قانون کے حوالے کر دیتا۔

اُن دنوں شہر میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ چور رات کو مکانوں اور دُکانوں میں نقب لگا کر گھُس جاتے اور قیمتی سامان سمیٹ کر فرار ہو جاتے۔ کُچھ لوگوں نے اُن کا مُقابلہ کرنے کی کوشش کی

تو انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

جب یہ وارداتیں عام ہو گئیں اور اخبارات نے شور مچا مچا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا تو پولیس کے بڑے بڑے افسر سر جوڑ کر بیٹھے کہ کس طرح اِن چوروں کا قلع قمع کیا جائے۔ اب تک جتنے انسپکٹروں کو انہیں پکڑنے کے لیے لگایا گیا تھا، اُن سب نے ناکامی کا مُنہ دیکھا تھا اور چور بدستور شہر میں دندناتے پھر رہے تھے۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد یہ اہم ذمّے داری انسپکٹر سعید کو سونپنے کا فیصلہ کیا گیا اور انسپکٹر سعید اسی دِن سے چند پولیس کانسٹیبلوں کے ساتھ رات کو شہر میں گشت کرنے لگا۔

سعید کو ڈیوٹی سنبھالے دوسرا دِن تھا۔ وہ رات کے بارہ بجے کار میں بیٹھ کر شہر کی گشت کو نکلا۔ اُس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل، دو کانسٹیبل اور ایک تجربہ کار ڈرائیور تھا۔ یہ سب سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اِن کی کار بھی دیکھنے میں عام کاروں کی طرح تھی۔ لیکن اُس میں وائرلیس ایریل لگا ہوا

تھا جس کے ذریعے انسپکٹر اپنے ہیڈ کوارٹر سے بات کر سکتا تھا۔ کار کے سامنے کے شیشے (ونڈ اسکرین) پر پولیس کا نشان بنا ہوا تھا جو صرف اُس وقت نظر آتا تھا جب ڈرائیور ایک خاص بٹن دبا کر اس کی بتّی جلاتا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی کار میں لگا ہوا خطرے کا سائرن بجنے لگتا تھا جس سے آس پاس موجود پولیس کے سپاہیوں اور عام لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ پولیس والے ہیں اور انہیں مدد کی ضرورت ہے۔

کار پندرہ میل فی گھنٹے کی رفتار سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور انسپکٹر سعید کی عقابی نگاہیں سڑک کے ارد گرد دکانوں اور مکانوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اب ایک بج گیا تھا اور سڑکوں پر ٹریفک آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔

"الفنسٹن اِسٹریٹ کی طرف چلیے صاحب!" ہیڈ کانسٹیبل نے انسپکٹر سے کہا۔ "وہاں جوہریوں کی دُکانیں ہیں اور پچھلے دنوں وہاں دو دُکانوں میں نقب لگ چکی ہے۔"

انسپکٹر سعید نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا اور ڈرائیور نے کار کا رُخ الفنسٹن اِسٹریٹ کی طرف موڑ دیا۔ سڑک پر ٹریفک بُہت معمُولی تھی۔ کہیں کہیں کوئی کار زن سے گزر جاتی یا اِدھر اُدھر کوئی اِکّا دُکّا راہ گیر نظر پڑ جاتا۔ یہاں آ کر کار کی رفتار اور ہلکی ہو گئی اور انسپکٹر اور اُس کے ساتھی چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے۔ اب دو بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ وہ کیپیٹل سینما سے ایک فرلانگ آگے نکل آئے تھے کہ اچانک دائیں جانب ایک گلی کے نُکّڑ پر ایک بڑی سی پرانی کار آ کر رُکی۔ انسپکٹر نے اپنے ڈرائیور کو کار روکنے کے لیے کہا اور اُس نے آہستہ سے بریک لگا کر کار ایک دُکان کے سائبان کے نیچے کھڑی کر لی۔

پولیس کار سے اُس کار کا فاصلہ تین سو گز ہو گا۔ انسپکٹر نے اُس کار میں سے دو آدمیوں کو اُترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ کسی دُکان کے مالک ہوں یا پھر ملازم۔ خیر، ہمیں اِن پر نگاہ رکھنی چاہیے۔"

"جہاں اِن لوگوں کی کار کھڑی ہے، وہاں ایک مشہور جوہری کی دُکان ہے جو ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے زیورات کا بیوپار کرتا ہے۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "مُجھے تو دال میں کُچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے۔"

"آؤ، دیکھتے ہیں۔" انسپکٹر سعید نے کہا اور ڈرائیور کو وہیں کار میں چھوڑ کر باقی ساتھیوں کے ساتھ چھپتا چھپاتا اُس کار کی طرف بڑھا۔

اب وہ کار سے پچاس گز کے فاصلے پر تھے۔ اچانک کار والے لوگ حرکت میں آ گئے۔ کار کے پیچھے ایک لمبی سی زنجیر بندھی ہوئی تھی اور اُس کے دوسرے سِرے پر ایک ہُک لگا تھا۔ ایک آدمی نے وہ ہُک جوہری کی دُکان کی کھڑکی کی سلاخ میں پھنسا دیا اور کار میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبا کر کار کو آگے بڑھایا تو کھڑکی کی سلاخ اُکھڑ کر نیچے گِر پڑی۔ اِس طرح اُنھوں نے تین سلاخیں اکھاڑ لیں۔ اِس کے بعد ایک آدمی نے زنجیر سمیٹ کر کار کی ڈگی میں ڈال

دی اور دوسرے نے سلاخ سے شیشے توڑ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ دونوں آدمی دُکان میں گھُس گئے اور انھوں نے الماریوں اور شوکیسوں میں سے ہیرے جواہرات اور زیورات نکال نکال کر ایک سوٹ کیس میں بھرنے شروع کر دیے۔

انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔ "لینا! پکڑنا! بھاگنے نہ پائیں!" یہ کہہ کر وہ دُکان کی طرف جھپٹا۔ اس کی آواز پولیس کار کے ڈرائیور نے سُنی تو وہ کار کو آگے لے آیا اور جھٹ سائرن کا بٹن دبا دیا۔ کار کی ونڈ اسکرین پر پولیس کا نشان جگمگا اُٹھا اور اِس کے ساتھ ہی زور زور سے سائرن بجنے لگا۔

چور گھبرا گئے۔ وہ جلدی سے کھڑکی سے باہر کُودے، کار میں سوٹ کیس پھینکا اور پھرُتی سے کار میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور تیّار بیٹھا تھا۔ اس نے پوری رفتار سے کار دوڑا دی۔ انسپکٹر سعید اور اُس کے ساتھی پولیس کار میں سوار ہوئے اور انسپکٹر نے ڈرائیور سے کہا۔ "کار کا پیچھا کرو۔ نکلنے نہ

پائے۔"

ڈرائیور نے جلدی جلدی گیئر بدلے اور ایکسی لیٹر کو پورا دیا دیا۔ اب دونوں کاریں ہوا کے دوش پر اُڑی چلی جا رہی تھیں۔ آگے آگے چوروں کی کار تھی اور اُس کے پیچھے پچاس گز کے فاصلے پر، پولیس کار۔

"ٹکّر ماروں صاحب؟" ڈرائیور نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"نہیں۔" انسپکٹر جلدی سے بولا۔ "یہ خطرناک ہوگا۔ ہوسکتا ہے ہماری کار بھی اُلٹ جائے۔ تعاقب جاری رکھو اور اپنی کار اُن کی کار کے برابر لانے کی کوشش کرو۔"

"برابر؟" ہیڈ کانسٹیبل نے تعجّب سے کہا۔ "کیا آپ انہیں گولی ماریں گے؟"

"نہیں" انسپکٹر نے جواب دیا اور ڈرائیور کو حُکم دیا۔ "آگے، آگے اور

آ گے ۔ شاباش!" کار بالکل اُس کے پہلو میں لے جاؤ اور اُسے آگے نہ نکلنے دو۔ یہ کہہ کر اُس نے کار کا دروازہ کھولا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں، صاحب!" ہیڈ کانسٹیبل گھبرا کر بولا۔ "جو کچھ ہونے والا تھا، اُس کے تصوّر ہی سے اُس کی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ "جان بوجھ کر اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالیے، صاحب۔"

"خاموش!" ڈرائیور! کار تھوڑی اور آگے کرو۔"

اب دونوں کاریں پہلو بہ پہلو، ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اچانک انسپکٹر سعید نے گہری سانس لی، کار کا دروازہ کھولا، اور ایک دم چھلانگ لگا کر چوروں کی کار کی کھڑکی سے لٹک گیا۔ اُس کے ساتھیوں کی چیخ نکل گئی۔

چوروں کے ڈرائیور نے ایک ہاتھ سے انسپکٹر کو دھکّا دینے کی کوشِش کی مگر وہ مضبوطی سے کھڑکی کے ساتھ چمٹا رہا۔ یکایک پیچھے سے ایک چور نے ہاتھ بڑھا کر پستول کا دستہ انسپکٹر کے سر پر مارا۔ انسپکٹر کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ دونوں کاریں ساٹھ ستّر میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ رہی تھیں۔ اگر پولیس کار کا ڈرائیور تجربہ کار اور مشّاق نہ ہوتا تو انسپکٹر کو کُچل کر رکھ دیتا۔ اُس نے کمال ہوشیاری اور حاضر دماغی سے کار جھٹ دائیں طرف کر لی۔

"تعاقب جاری رکھو؟" ہیڈ کانسٹیبل نے ڈرائیور سے کہا۔ "انسپکٹر سعید کی

قربانی ضائع نہ جانا چاہیے۔"

لیکن اب ڈرامے کا انجام قریب آگیا تھا۔ جب انسپکٹر سعید چوٹ کھا کر نیچے گِرا تو چوروں کے ڈرائیور نے یہ دیکھنے کے لیے کھڑکی سے باہر جھانکا کہ اس پر کیا بیتی۔ بس اُس کا دیکھنا غضب ہو گیا۔ سامنے دیوار تھی۔ ساٹھ ستّر میل کی رفتار سے چلنے والی کار ایک دھماکے کے ساتھ دیوار سے جا ٹکرائی۔

کچھ دیر بعد اُس کار میں سے تین آدمی ہڈّیاں پسلیاں سہلاتے باہر نکلے۔ صرف ڈرائیور کے تھوڑی سی چوٹ لگی تھی۔ باقی دونوں آدمی صاف بچ گئے تھے۔ سپاہیوں نے تینوں کے ہتھکڑیاں لگا دیں۔ اب ہیڈ کانسٹیبل انسپکٹر سعید کی خبر لینے دوڑا۔ خُدا کا شکر ہے اس کے کُچھ زیادہ چوٹ نہ لگی تھی۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہاتھ پاؤں سیدھے کر رہا تھا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔ "میں خیریت سے ہوں۔

صرف کہنیوں اور گھٹنوں پر خراشیں آئی ہیں اور کُچھ درد بھی ہو رہا ہے۔ تُم نے چوروں کو پکڑ لیا؟"

"جی جناب!" ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "اور چوری کا مال بھی برآمد کر لیا۔ مگر صاحب، آپ نے جو کارنامہ کیا ہے اُسے میں زندگی بھر نہیں بھُولوں گا۔ اگر تمام پولیس والے آپ جیسے بہادر اور فرض شناس ہوں تو ملک سے بدمعاشوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔"

دوسرے دِن انسپکٹر سعید کا یہ کارنامہ مُلک کے تمام اخبارات نے جلّی سُرخیوں سے شائع کیا اور ایک ہفتے بعد آئی جی صاحب نے اُسے ایک خاص تقریب میں پولیس کا سب سے بڑا اعزاز تمغہ شجاعت عطا کیا۔

(تعلیم و تربیت اگست ۱۹۹۰)

رات کے نو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ انسپکٹر سعید نے میز پر سے چائے کی پیالی اُٹھائی اور ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پیالی رکھ کر اُس نے جلدی سے ریسیور اُٹھایا۔ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اہم بات ہے۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ جی۔۔۔ جی۔ گھبرائیے نہیں۔ پولیس آپ کی پوری مدد کرے گی۔۔۔ اجی

صاحب، اِس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔ خُدا حافظ۔"

اس نے کھٹاک سے ریسیور رکھا اور ہیڈ کانسٹیبل کی طرف متوجّہ ہوا جو دوسری میز پر بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا۔ "ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں ڈاکا پڑا ہے۔ ڈرائیور سے کہو کار نکالے۔ ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہے۔"

اور اس کے چند ہی منٹ بعد پولیس کی کار فیروز پور روڈ پر پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ انسپکٹر نے ہیڈ کانسٹیبل کو بتایا:

"کوئی پروفیسر احمد علی بیگ صاحب ہیں۔ وہ اُن کی بیوی اور اُن کا کوئی عزیز کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک ایک شخص کھڑکی میں سے کود کر اندر آگیا اور ۵۰ ہزار روپیہ نقد اور تقریباً اتنی ہی مالیت کے زیورات لوٹ کر لے گیا۔"

پندرہ منٹ بعد ان کی کار سی بلاک ماڈل ٹاؤن کی ایک خُوب صورت سی

کوٹھی کے آگے کھڑی تھی۔ انسپکٹر سعید اور ہیڈ کانسٹیبل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو پروفیسر صاحب لان میں ٹہل رہے تھے۔ وہ انہیں ڈرائینگ روم میں لے گئے جہاں پروفیسر صاحب کی بیگم اور ایک اور صاحب پہلے سے موجود تھے۔

"جیسا کہ میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا۔" پروفیسر صاحب آنکھوں پر چشمہ جماتے ہوئے بولے۔ "ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں، میری بیوی اور اِن کا بھائی۔ معاف کیجیے، بیوی کے بھائی کو کیا کہتے ہیں؟"

"برادرِ نسبتی۔۔۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"بہت مُشکل لفظ ہے۔" پروفیسر صاحب بولے۔ "ایک آسان سا لفظ بھی تو ہے؟"

"سالا۔۔۔" انسپکٹر دھیرے سے مُسکرایا۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ سالا۔" پروفیسر صاحب خُوش ہو کر بولے۔ "تو صاحب میں، میری بیوی اور میرے سالے صاحب کھانا کھا رہے تھے۔۔۔ یا شاید کھا چکے تھے اور۔۔۔"

"اُس وقت ہم لوگ کسٹرڈ کھا رہے تھے۔" بیگم صاحبہ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ یاد آیا۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ خانساماں نے کسٹرڈ میں کچّے کیلے ڈال دیے ہیں۔ خیر صاحب، ایکا ایکی ایک نامعقول شخص کھڑکی سے اندر کُودا اور اِس سے پہلے کہ ہم ہوشیار ہوتے، اُس نے پستول کی نال بیگم کی کنپٹی پر رکھ دی۔۔۔ اب اِس کے بعد کی کہانی آپ کو بیگم سُنائیں گی۔" پروفیسر صاحب میز پر طبلہ بجاتے ہوئے بولے۔ وہ مُجھے بیڈروم میں لے گیا۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "جہاں سیف رکھا ہوا ہے۔ اُس نے مُجھ سے چابیاں لیں، سیف کھولا اور ۵۰ ہزار روپیہ اور اتنی ہی قیمت کے زیورات لے کر چمپت ہو گیا۔"

"اور آپ لوگ چُپ چاپ بیٹھے رہے؟" انسپکٹر نے پروفیسر صاحب اور اُن کے سالے صاحب کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔ کیوں کہ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔" پروفیسر نے کہا۔

"اور وہ بھی بھرا ہوا۔" سالے صاحب بولے۔

"ہوں!" انسپکٹر نے گہری سانس لی۔ "آپ نے اس کی صورت تو دیکھی ہو گی؟"

"جی ہاں۔" پروفیسر صاحب نے بتایا۔ "میں اُسے دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے" انسپکٹر نے کہا۔ "آپ لوگ، مہربانی کر کے میرے ساتھ چلیے۔ ہمارے پاس شہر کے تمام غنڈوں اور بدمعاشوں کی تصویریں ہیں۔ مُمکن ہے اُن میں اِس شخص کی تصویر بھی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر مُجرم کو پکڑنا

کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔"

آدھ گھنٹے بعد پروفیسر صاحب، اُن کی بیگم اور بیگم کے بھائی انسپکٹر سعید کے دفتر میں بیٹھے چوروں اور ڈاکوؤں کی تصویریں دیکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹا گُزر گیا مگر اُس شخص کی تصویر نہ ملی جس نے پروفیسر صاحب کی کوٹھی میں ڈاکا ڈالا تھا۔ پروفیسر صاحب نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اگر آپ اتنا بتا دیں کہ اُس کی شکل کیسی تھی تو میں اُس کا حُلیہ شہر کے تمام تھانوں کو بھجوا دوں گا۔" پولیس جلد ہی اُسے پکڑ لے گی۔ یہ کہہ کر انسپکٹر کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔

پروفیسر صاحب بولے۔ "لمبا سا آدمی تھا۔ تقریباً چھ فٹ اُونچا، کالے بال تھے اور۔ ۔ ۔"

"دُبلا پتلا، چھریرا بدن۔" بیگم بولیں۔

"جی ہاں۔" بیگم صاحبہ کے بھائی نے کہا۔ "لمبی سی ناک تھی۔۔۔"

"ناک لمبی تھی یا چپٹی، یہ مُجھے یاد نہیں۔ ہاں اِتنا خوب یاد ہے کہ اُس کے گال پر زخم کا نشان تھا۔"

"یہ تو آپ نے بڑے پتے کی بات بتائی۔" انسپکٹر خوش ہو کر بولا۔ "اور کوئی خاص بات؟"

"جی ہاں۔" پروفیسر صاحب نے سوچتے سوچتے کہا۔ "اُس کی ٹھوڑی میں گڑھا بھی تھا۔"

"آپ کو یقین ہے کہ اُس کی ٹھوڑی میں گڑھا تھا؟" بیگم صاحبہ بولیں۔ "مُجھے یاد نہیں۔"

انسپکٹر نے قلم میز پر رکھ دیا اور گہری سانس لی۔ ایسے موقعوں پر اکثر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ لوگوں کو مجرم کی مختلف باتیں یاد رہ جاتی ہیں اور اُن کی مدد

سے اُس کا صحیح حُلیہ ذہن میں بٹھانا بہت مُشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی انسپکٹر نے تینوں آدمیوں کے بیانات کی روشنی میں ڈاکو کا حُلیہ لکھا اور اُس کی نقلیں کرواکر شہر کے تمام تھانوں کو بھجوادیں۔ اُس کا خیال تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اُسے کوئی اچھّی خبر ملے گی۔

مگر اُس کا خیال غلَط تھا۔ ساتویں دِن اُس نے پروفیسر صاحب کو فون پر بتایا۔ "افسوس ہے کہ پولیس ڈاکو کا سُراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ پتا نہیں اُسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ بہر حال میں ابھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ آپ، براہِ کرم، تینوں صاحبان تھانے تشریف لے آئیے۔ میرے دماغ میں ایک اور خیال آیا ہے۔"

پروفیسر صاحب، ان کی بیگم اور بیگم کے بھائی انسپکٹر سعید کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہ اُنھی کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر زور سے آواز دی۔ "فیضی صاحب اندر تشریف لائیے۔" چند لمحے

بعد ایک چھوٹے قد کا خشخشی ڈاڑھی والا شخص اندر داخل ہوا۔

"یہ ہمارے آرٹسٹ ہیں، فیضی صاحب۔" انسپکٹر نے تعارف کرایا۔
"آپ انہیں اُس شخص کا حُلیہ بتائیے۔ یہ اُس کے مُطابق اُس کی تصویر بنائیں گے۔"

فیضی اُن کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں کاغذوں کا پیڈ اور پنسل تھی۔ اُس نے کہا۔ "جی، پہلے آپ فرمائیے، پروفیسر صاحب۔ اُس کا چہرا کیسا تھا؟"

"لمبوترا، سُتا ہوا۔ کالے بال تھے اور۔ ۔ ۔" پروفیسر صاحب بولے۔

"اور لمبی سی ناک تھی۔" بیگم صاحبہ کے بھائی نے کہا۔

"یہ مجھے یاد نہیں۔ البتّہ یہ یاد ہے کہ اُس کے گال پر زخم کا نشان تھا۔" بیگم نے کہا۔

"اور ٹھوڑی میں گڑھا بھی تھا۔ یہ مُجھے خوب یاد ہے۔" پروفیسر صاحب نے اعلان کیا۔

فیضی کی پنسل تیزی سے کاغذ پر چل رہی تھی۔ چند منٹ بعد اُس نے تصویر مکمّل کرلی اور بولا۔ "ڈاڑھی مونچھیں تو نہیں تھیں اُس کی؟"

"جی نہیں۔ بالکل صفاچٹ چہرہ تھا۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"ایسا؟" فیضی انہیں تصویر دِکھا کر بولا۔

"ارے واہ! آپ نے تو کمال کر دیا؟" پروفیسر صاحب اُچھل کر بولے۔ "بالکل ایسا ہی تھا وہ مردُود۔"

"ذرا ٹھہریے۔" بیگم صاحبہ جلدی سے بولیں۔ "زخم کا نشان یہاں نہیں تھا، یہاں تھا۔" انھوں نے آنکھ کے نیچے اُنگلی رکھ کر بتایا۔ فیضی نے وہاں سے نشان ہٹا کر اُن کی بتائی ہوئی جگہ پر بنا دیا۔

"اب بالکل ٹھیک ہے۔" بیگم صاحبہ بولیں۔ "بالکل ایسا ہی تھا۔"

پروفیسر صاحب کے جانے کے بعد انسپکٹر نے فیضی کا اسکیچ بلاک بننے کے لیے بھیج دیا۔ پھر اُس بلاک سے سینکڑوں تصویریں چھاپی گئیں اور ملک کے تمام شہروں کی پولیس کو بھیج دی گئیں۔

"اب میں اطمینان سے بیٹھ کر نتیجے کا انتظار کروں گا۔"

انسپکٹر نے دِل میں کہا۔ "اور مُجھے یقین ہے اس دفعہ ضرور کوئی اچھّی خبر موصول ہوگی۔"

اُس کا خیال درست تھا۔ ملک کے سارے سُراغ رساں ڈاکو کی تلاش میں سرگرم تھے۔ ان میں مجید نام کا ایک سُراغ رساں بھی تھا۔ اُس نے صدر کے علاقے میں ایک مشہور ہوٹل کے بیرے کو ڈاکو کی تصویر دِکھا کر پوچھا۔

"تم نے اِس آدمی کو کبھی دیکھا ہے؟"

بیرے نے غور سے تصویر کو دیکھا اور بولا۔ "اِس شکل کا ایک آدمی اکثر ہمارے ہوٹل میں کھانا کھانے آتا ہے۔ بڑا سخی داتا ہے۔ بیرے کو کم سے کم ایک روپیہ بخشیش ضرور دیتا ہے۔"

سُراغ رساں مجید نے اِس ہوٹل کی نگرانی کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے ہی دِن دوپہر کے وقت اُس نے ایک لمبے سے آدمی کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ اُس کی شکل اس تصویر سے ہو بہو ملتی تھی جو اُسے انسپکٹر سعید نے بھیجی تھی۔

وہ شخص ہوٹل میں جا کر ایک طرف بیٹھ گیا اور بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا۔ مجید باہر کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ کھانا کھا چُکا تو بل دے کر چُپ چاپ باہر نکلا اور ایک طرف کو چل دیا۔ مجید اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ شخص کُچھ دور جا کر ایک مکان کے دروازے کے پاس ٹھہر گیا اور جیب میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے لگا۔ اچانک اُس نے اپنے کاندھے پر کسی

کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ ایک دم پلٹ کر دیکھا تو سٹّی گُم ہو گئی۔ پولیس کا آدمی سادہ کپڑوں میں بھی پہچانا جاتا ہے۔

"میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔" مجید نے کہا۔

"مگر کیوں؟" اُس نے گھبرا کر کہا۔ "میرا قصور کیا ہے؟"

"یہ تمھیں تھانے جا کر معلوم ہوگا۔" مجید نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

تھانے پہنچ کر مجید نے انسپکٹر سعید کو ٹیلی فون کیا۔ "میرا خیال ہے میں مُجرم کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" انسپکٹر سعید نے کہا۔

وہ پہلے ماڈل ٹاؤن گیا۔ وہاں سے پروفیسر احمد علی، اُن کی بیگم اور بیگم کے بھائی کو لیا اور پھر تھانے پہنچا۔ تینوں نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اِس کے بعد انسپکٹر ڈاکو کو لے کر اُس کے گھر گیا اور وہاں سے چوری کا سارا مال

برآمد کرلیا۔ ایک بار پھر جُرم کے خلاف جنگ میں انسپکٹر سعید کو فتح ہوئی تھی اور وہ اپنی اِس فتح پر بہت خوش تھا، بہت مسرور تھا۔ شہر کے تمام اخبارات میں اُس کی تصویریں چھپی تھیں اور رپورٹروں نے مزے لے لے کر اُس کے کارنامے کا حال شائع کیا تھا۔

(تعلیم و تربیت ستمبر ۱۹۹۰)

شام کا وقت تھا۔ سہ پہر سے بَینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ شہر کی سڑکیں سُنسان تھیں اور سوائے اِکّا دُکّا موٹروں کے اور کوئی ٹریفک نہ تھی۔ ایسے میں غالب بینک لمیٹڈ کی ایک شاخ سے بینک کی وَین روپیہ لے کر بینک کے ہیڈ آفس جا رہی تھی۔ یہ روز کا دستور تھا۔ دِن میں جتنا روپیہ بینک میں جمع ہوتا، شام کو ہیڈ آفس پہنچا دیا جاتا۔

ڈرائیور کے علاوہ وَین میں دو چوکیدار تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں بھری ہوئی بندوقیں تھیں۔ اُن کے سامنے والی سیٹ پر نوٹوں سے بھرے ہوئے دو بیگ رکھے تھے۔ سڑک کی بتّیاں روشن تھیں لیکن بارش کی وجہ سے راستہ صاف نظر نہ آرہا تھا۔

وَین بَرکی اسٹریٹ سے نکل کر کھُلی سڑک پر آئی ہی تھی کہ اچانک کالے رنگ کی ایک ٹیوٹا کار بائیں جانب سے آئی اور وَین کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ وَین کا ڈرائیور بریک نہ لگاتا تو تصادُم یقینی تھا۔ وہ کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ اتنے میں ایک ڈاٹسن کار دائیں جانب سے آئی اور ان دونوں کاروں کے پاس آکر رُک گئی۔ اُس میں سے ایک نقاب پوش ڈاکو اُترا اور بجلی کی سی تیزی سے وَین کے ڈرائیور کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ عین اُسی وقت ٹیوٹا کار میں سے چار نقاب پوش ڈاکو نکلے اور اُنھوں نے وَین کا دروازہ کھول کر چوکیداروں پر حملہ کر دیا۔ چوکیداروں نے

مزاحمت کی، مگر دو اور چار کا مُقابلہ تھا۔ ڈاکوؤں نے سروں پر پستولوں کے دستے مارمار کراُنہیں بے ہوش کر دیا۔ اُدھر وہ پہلا آدمی ڈرائیور کو بے ہوش کرچکا تھا۔ ڈاکوؤں نے تینوں آدمیوں کو وَین سے گھسیٹ کر سڑک پر ڈال دیا۔ دو ڈاکو وَین میں سوار ہو گئے۔ باقی تین ٹیوٹا میں، اور آناً فاناً دونوں گاڑیاں ہواہو گئیں۔

تقریباً دو ڈھائی میل دور جا کر بینک کی وَین ایک مکان کے دروازے پر رُک گئی۔ یہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈاکوؤں نے وَین سے نوٹوں کے بیگ نکالے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔

انسپکٹر سعید کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور کان سے لگایا اور پھر ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اِسی ڈکیتی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ وہ دو تین کانسٹیبلوں کو لے کر فوراًاس جگہ پہنچا جہاں ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ وَین کا ڈرائیور اور چوکیدار ہوش میں آ گئے تھے مگراُن کے سر

میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ ڈرائیور نے رُک رُک کر بڑی مُشکل سے بتایا:

"یہ سب کُچھ اچانک ہوگیا۔ اُنھوں نے ایک دم ہمیں آلیا اور بے ہوش کر کے سڑک کے کنارے ڈال گئے۔ کُچھ ڈاکو ٹیوٹا میں آئے تھے اور کُچھ ڈاٹسن میں۔ ٹیوٹا کا نمبر BX275 تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہی نمبر تھا۔ مُجھے خوب یاد ہے۔"

انسپکٹر نے وائرلیس کے ذریعے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اِطّلاع دی۔ اس کے بعد اُس نے سڑک کا معائینہ کیا کہ شاید ڈاکو کوئی سُراغ چھوڑ گئے ہوں۔ اُسے قریب ہی ایک بڑا سا رومال پڑا ہوا ملا جسے کسی ڈاکو نے نقاب کے طور پر استعمال کیا ہو گا۔ اس کے علاوہ چند بٹن بھی ہے جو شاید چوکیداروں کے ساتھ ہاتھا پائی میں کسی ڈاکو کے ٹوٹ گئے تھے۔

"جب ہاتھا پائی ہوتی ہے تو ڈاکو اپنی کوئی نہ کوئی چیز ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔"

انسپکٹر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اِنھیں سنبھال کر رکھ لو، کام آئیں گی۔"

دوسرے دِن صُبح کو ہیڈ کانسٹیبل نے انسپکٹر کو آ کر بتایا دونوں کاروں کا کھوج لگا لیا گیا ہے۔ یہ کاریں ڈاکے سے کُچھ دیر پہلے چُرائی گئی تھیں۔"
"ٹھیک ہے۔ اُنہیں یہاں لے آؤ۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اور سُنو۔ کاروں کے مالکوں سے کہو، میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ٹیوٹا کار ایک ڈاکٹر کی تھی اور ڈاٹسن کسی اخبار کے اڈیٹر کی۔ وہ بے چارے سخت پریشان تھے اور بار بار پولیس کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کی کار میں سے نقب لگانے کے اوزار نکلے اور اڈیٹر کی کار میں سے ایک پرانی برساتی (رین کوٹ)۔

"ہمیں چار سُراغ مل چکے ہیں۔" انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "رومال یعنی نقاب، نقب زنی کے اوزار، کوٹ کے بٹن اور۔ ۔ ۔ یہ برساتی۔ اِن

چاروں میں سے صرف ایک چیز ایسی ہے جو ہمارے کام آ سکتی ہے، اور وہ ہے۔۔۔۔ برساتی۔"

انسپکٹر برساتی کے کالر کے اندر ایک دُھندلے سے نشان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ اُس لانڈری کا نشان ہے جہاں یہ برساتی دُھلوائی گئی تھی۔ اگر ہم نے اس لانڈری کا پتا چلا لیا تو پھر برساتی کے مالک کا پتا بھی چل جائے گا۔ پھر اُس کے ذریعے ہم دوسرے ڈاکوؤں کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ آؤ، کام شروع کر دیں۔" چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پولیس نے لانڈری کا کھوج لگا لیا۔ اُس کا نام دِل شاد لانڈری تھا اور وہ شہر کے ایک گُنجان محلّے میں تھی۔ انسپکٹر سعید نے لانڈری کے مالک کو ڈکیتی کے متعلّق تفصیل سے بتایا اور کہا۔ "اگر برساتی کا مالک مل جائے تو ڈاکوؤں کو پکڑنے میں مدد مل سکتی ہے۔"

لانڈری کے مالک نے بے زاری سے سر ہلایا اور بولا۔ "میرے پاس دِن

میں بیسیوں گاہک آتے ہیں۔ اب میں کس کس کا نام پتا یاد رکھوں؟ اور پھر اِس نشان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برساتی سال ڈیڑھ سال پہلے دُھلوائی گئی تھی۔ اتنی پُرانی رسیدیں ہم سنبھال کر نہیں رکھتے۔ مُجھے افسوس ہے کہ میں۔۔۔۔ آہا! ذرا ٹھہریے۔" اُس نے برساتی کا کونا غور سے دیکھتے ہوئے کہا:
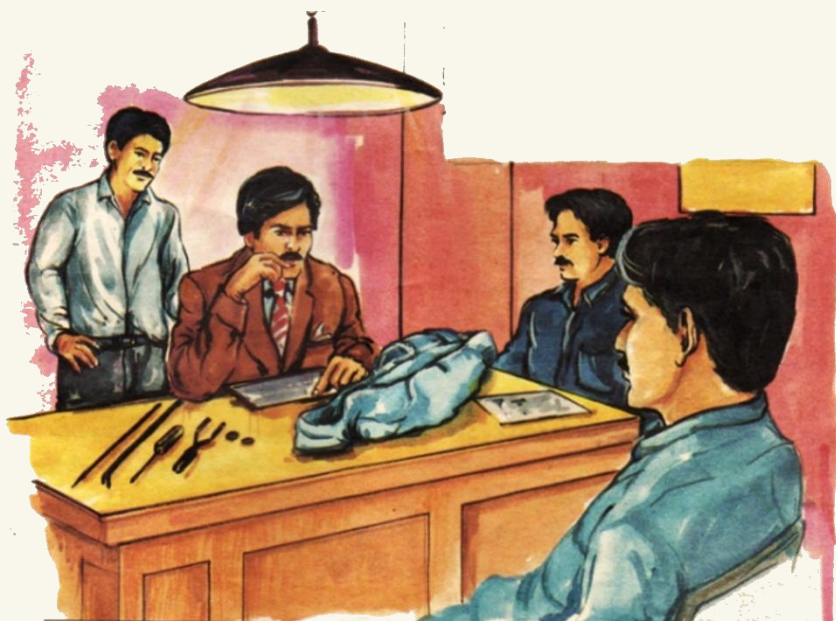
"یہ۔۔۔۔ یہ وہی ہے۔ مُجھے یاد آگیا۔ اِس کا کونا اِستری کرتے وقت جل

گیا تھا اور میں نے اِس کے مالک کو ۲۰ روپے دے کر جان چھڑائی تھی۔ صاحب، بڑا ظالم آدمی تھا۔ میں اُسے روپے نہ دیتا تو میرا سر پھوڑ دیتا۔ یہ کوئی چھ مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔ ٹھہریے، میں رسید بُک نکال کر دیکھتا ہوں۔"

اُس نے چھ مہینے پہلے کی رسید بُکیں نکالیں اور پندرہ منٹ اُنھیں اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد چلّا کر بولا۔ "یہ رہی وہ رسید۔ اس کا نام عبدالرشید ہے اور پتا ہے، گلی نمبر ۱۰ بھاگوان پورہ۔"

انسپکٹر سعید لانڈری والے کا شکریہ ادا کر کے اُسی وقت عبدالرشید کے گھر پہنچا اور اُسے برساتی دِکھا کر بولا۔ "یہ برساتی غالباً آپ کی ہے؟"

"جی۔۔۔ ہیں ہاں۔۔۔۔ میری ہی ہے اور کُچھ دِن ہوئے چوری ہو گئی تھی۔" عبدالرشید نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "یہ آپ کو کہاں سے ملی؟"

انسپکٹر نے اُسے ساری تفصیل بتائی اور کہا۔ "اگر میں آپ کے گھر کی تلاشی لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"ارے صاحب، مُجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "جو مرضی چاہے کیجیے۔ آپ کو اختیار ہے۔ البتّہ اِتنا میں بتا دوں کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ ڈاکا ڈالنا تو بڑی بات ہے، میں نے آج تک کسی کا تنکا تک نہیں چُرایا۔"

انسپکٹر نے اپنے آدمیوں کو گھر کی تلاشی لینے کا حُکم دیا۔ پولیس کے سپاہی سارے گھر میں پھیل گئے اور اُنھوں نے ایک ایک کونا چھان مارا مگر کُچھ نہ ملا۔

ایک کانسٹیبل مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اوپر کوئی کمرا نہ تھا۔ صرف دائیں جانب پانی کی ٹنکی تھی۔ کانسٹیبل مایوس ہو کر نیچے اُترنے ہی والا تھا کہ اُسے ٹنکی کے پیچھے کوئی چیز نظر آئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا۔
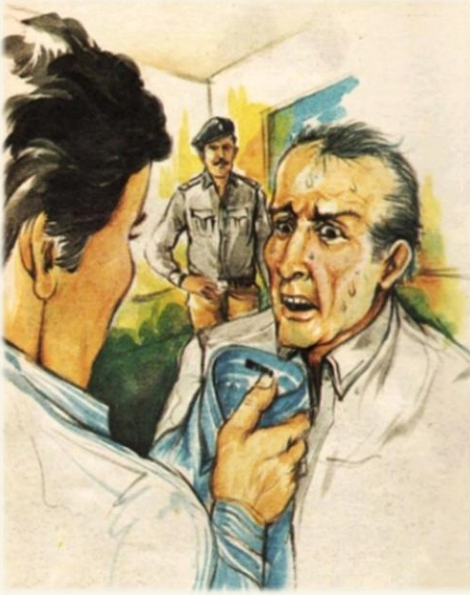
یہ ایک سوٹ کیس تھا۔ اُس نے انسپکٹر کو آواز دی صاحب!

"اوپر آئیے۔"

انسپکٹر دوڑتا ہوا اُوپر پہنچا اور ٹنکی کے پیچھے دیکھا تو وہاں ایک کے بجائے دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے، نوٹوں سے لبالب بھرے ہوئے۔

"کھیل ختم ہو گیا۔" انسپکٹر نے عبدالرشید سے کہا۔ "میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو!"

تھانے جا کر انسپکٹر نے عبدالرشید سے اُگلوا لیا کہ وہ بھی ڈکیتی میں شریک تھا اور شام تک اُس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بھی بتا دیے۔ پولیس نے اُنہیں بھی چھاپے مار کر پکڑ لیا۔

”مجرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی سُراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔“ انسپکٹر سعید نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ ”اِس مرتبہ وہ برساتی چھوڑ گئے اور اُس کی مدد سے ہم اُنھیں پکڑنے میں کام یاب ہو گئے۔“

(تعلیم و تربیت اکتوبر ۱۹۹۰)

انسپکٹر سعید جہاز کے عرشے پر کھڑا سمندر کی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم خوش گوار تھا۔ وہ ایک سرکاری کام سے بحرین گیا تھا اور ایک ہفتے کے بعد واپس آ رہا تھا۔

انسپکٹر سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بچّی اپنی ماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گڑیا تھی اور وہ اسے سینے سے لگا کر تھپک رہی تھی۔

اچانک جہاز کو جھٹکا لگا اور وہ تھوڑا سا ایک طرف کو جھُک گیا۔ انسپکٹر سعید

اور عورت نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا مگر بچّی جنگلے سے ٹکرا گئی اور گڑیا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گِر پڑی۔ اگر انسپکٹر دوڑ کر گڑیا کو نہ پکڑ لیتا تو وہ سمندر میں گِر پڑتی۔ بچّی نے انسپکٹر سعید کا شکریہ ادا کیا اور گڑیا اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ انسپکٹر سعید نے محسوس کیا کہ بچّی کی ماں کا مُنہ فق ہو گیا ہے۔ اُس نے بچّی کے ہاتھ سے گڑیا چھین لی اور بولی: "میں نے کہا تھا نا کہ اِسے مُجھے دے دو۔ اگر اِس شریف آدمی کو ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو یہ سمندر میں گِر جاتی۔"

وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اُس نے انسپکٹر کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور بچّی کو کھینچتی ہوئی دوسری طرف لے گئی۔ انسپکٹر کی نگاہیں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ خُفیہ پولیس کی دس سالہ مُلازمت نے اُس میں لوگوں کے چہرے پڑھنے کا ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ آہستہ سے مُسکرایا۔ اس نے دِل ہی دِل میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جہاز کراچی کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ انسپکٹر اُس عورت کے پیچھے لگا رہا اور جب وہ کسٹمز آفیسر کے سامنے سامان چیک کرانے کھڑی ہوئی تو انسپکٹر نے آفیسر کو ایک خاص اشارہ کیا جسے عورت نے نہیں دیکھا مگر کسٹمز آفیسر سمجھ گیا۔

"آپ میرے ساتھ آئیے۔" آفیسر نے عورت سے کہا۔

عورت پہلے کُچھ کسمسائی ہچکچائی پھر اُس کے پیچھے ہولی۔ آفیسر اُسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ یہاں آ کر وہ پھٹ پڑی۔ "اِس کا کیا مطلب ہے؟ آپ مُجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ میں ایک عزّت دار خاتون ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ۔۔۔"

آفیسر نے بڑی نرمی سے اُس کی بات کاٹی۔ "آپ ناراض نہ ہوں۔ مُجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اصل میں کُچھ عرصے سے اسمگلروں کا ایک گروہ دوسرے مُلکوں سے ہیرے جواہرات پاکستان میں اسمگل کر رہا ہے۔

اس کا ہمیں پتا چلا ہے۔ مگر بد قسمتی سے ہم ابھی تک اُس گروہ کے کسی آدمی کو پکڑنے میں کامیاب ہو سکے لیکن ہو سکتا ہے۔ بسم اللہ آپ سے ہو۔"

"کیا کہتے ہو؟" عورت تڑخ کر بولی۔ "تُم نے میری توہین کی ہے۔ تمہیں اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

عین اُسی وقت کھٹ سے دروازہ کھلا اور انسپکٹر سعید اندر داخل ہوا۔ اُس نے کہا۔ "میرا خیال ہے، آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اِس گڑیا کے اندر چھُپی ہوئی ہے۔"

کسٹمز آفیسر نے عورت کے ہاتھ سے گڑیا لے لی اور میز کی دراز سے چاقو نکال کر اُس کا پیٹ چیرا تو اُس میں سے ایک تھیلی تھی جس کے اندر تین قیمتی ہیرے تھے۔

"میرا خیال صحیح نکلا۔" انسپکٹر سعید مُسکرا کر بولا۔ "گڑیا کے گِرنے پر اِس خاتون کا مُنہ فق ہو گیا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ دال میں کُچھ کالا کالا ہے۔ کیوں کہ اتنی سی گڑیا کے لیے عورت اِس قدر پریشان نہیں ہوگی۔"

کسٹمز آفیسر نے فوراً ہی پولیس کو فون کیا، ہیرے کسٹمز والوں نے ضبط کر لیے اور عورت کو پولیس پوچھ گُچھ کے لیے اپنے ساتھ لے گئی۔

چند منٹ بعد انسپکٹر سعید اور کسٹمز آفیسر آرام سے بیٹھے چائے کی چُسکیاں لے رہے تھے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "یہ اسمگلروں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے، مگر بلا کا چالاک، عیّار اور مکّار۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ دو سال سے یہ دھندا کر رہے ہیں اور اِن میں سے صرف دو آدمی باہر مال لاتے ہیں۔ ایک تو ہم نے آج پکڑ لیا۔ دوسرے کو پکڑنا ہے۔"

"کیا وہ بھی کوئی عورت ہے؟" کسٹمز آفیسر نے پوچھا۔

"نہیں۔" انسپکٹر سوچتے ہوئے بولا۔ "وہ مرد ہے اور لاہور میں رہتا ہے۔ ہمیں اُس پر کافی دنوں سے شک ہے۔ لیکن ابھی تک ہم اُس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مہیّا نہیں کر سکے ہیں جس کی بنا پر اُسے قانون کے شکنجے میں کسا جا سکے۔ خیر آج میں لاہور جا رہا ہوں۔ دیکھو، کیا ہوتا ہے۔"

لاہور پہنچ کر انسپکٹر سعید نے اُن لوگوں کا ریکارڈ دیکھا جو اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے یا جن پر پولیس کو اِس قسم کا شُبہ تھا۔ ایک گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد ایک کانسٹیبل کو بھیج کر حامد بِلّے کو بُلوایا جسے لوگ "ہیروں کا شہزادہ" کہتے تھے۔ یہ شخص ظاہر میں تو قالینوں کا کاروبار کرتا تھا، لیکن پولیس کو یقین تھا کہ یہ ہیرے اسمگل کرتا ہے۔

"دیکھو میاں۔" حامد بِلّا انسپکٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو اُس نے کہا۔ "ہم نے تمہارے گروہ کے ایک ممبر کو کراچی میں پکڑ لیا ہے۔ تمہیں یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تُم اِس گروہ کے لیڈر

ہو۔ اب تمہاری خیریت اِسی میں ہے کہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز آجاؤ اور شریفانہ زندگی بسر کرنے کا عہد کرو، ورنہ تمہیں علم ہے کہ کاٹھ کی ہنڈیا باربار چولہے پر نہیں چڑھتی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" حامد بِلّے نے ہنس کر کہا۔ "ایک دُنیا جانتی ہے کہ میں قالینوں کا بیوپاری ہوں اور اِس سِلسلے میں مُجھے باہر کے مُلکوں میں بھی جانا پڑتا ہے۔ یہ سفر میں باقاعدہ پاس پورٹ سے کرتا ہوں۔ چھُپ کر نہیں کرتا۔ آج تک میرے سامان سے کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جو قانون کی زد میں آتی ہو۔ پھر خُدا معلوم کیوں آپ کو میرے اوپر شک ہے۔ میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ اسمگلنگ کرنے والوں سے میرا کوئی تعلّق نہیں اور نہ میں اِس عورت کو ہی جانتا ہوں۔" باتیں کرتے وقت اس نے ایک بار بھی آنکھیں نہیں جھپکی تھیں۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے تکان بولتا رہا تھا۔

"تُم بڑے ڈھیٹ ہو۔" انسپکٹر نے مُسکرا کر کہا۔ "خیر بچُّو دیکھوں گا کب تک بچو گے۔ اب تُم جا سکتے ہو۔" حامد بِلّا مُسکراتا ہوا چلا گیا۔

انسپکٹر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر خیالات میں غرق ہو گیا۔ ہیرے مختلف طریقوں سے اسمگل کیے جاتے ہیں۔ بعض اسمگلر اپنے جوتوں کے تلوں میں انہیں چھپا لیتے ہیں، بعض اِس مقصد کے لیے بچّوں کے کھلونے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اُس عورت نے کیا تھا۔ لیکن انجام سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ کسی دِن ذرا سی بھول چُوک سے پکڑے جاتے ہیں۔

لیکن یہ شخص جسے لوگ ہیروں کا شہزادہ کہتے تھے، بڑا چالاک اور دیدہ دلیر تھا۔ پولیس نے بڑی کوشش کی کہ اِس کے پاس سے اسمگل کی ہوئی کوئی چیز نکل آئے مگر ہر بار ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ وہ بڑے مزے سے بحرین، سعودی عرب اور لیبیا وغیرہ جاتا اور کسٹمز والوں کی آنکھوں میں

دھول جھونک کر وہاں سے لاکھوں روپے کے ہیرے اسمگل کر کے لے آتا۔

انسپکٹر دیر تک سوچوں میں ڈوبا رہا اور جب اُس نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔

ایک مہینے کے بعد انسپکٹر سعید پھر اُسی جہاز میں بحرین سے وطن واپس آ رہا تھا۔ موسم خوش گوار تھا اور سمندر پُر سکون۔ وہ جنگلے سے لگا خیالوں میں گُم تھا کہ پیچھے سے ایک جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔ "اخّاہ انسپکٹر صاحب! آپ یہاں کیسے؟" یہ حامد بِلّا تھا۔

"میں سرکاری کام سے بحرین گیا تھا۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ اُس کی نگاہیں حامد بِلّے کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ "تُم اپنی سناؤ۔"

"میں بھی بحرین ہی سے آ رہا ہوں۔ قالینوں کے آرڈر لینے گیا تھا۔" اُس

نے جواب دیا۔ "لیکن آپ مُجھے اِس طرح گھور کیوں رہے ہیں؟"

"یہ میں کراچی پہنچنے پر بتاؤں گا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میں نے تمھارے راز کا پتا چلا لیا ہے۔"

انسپکٹر نے یوں ہی ہوا میں تیر چلایا تھا، مگر وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ حامد کے چہرے کی رنگت ایک دم بدل گئی۔ لیکن یہ صرف چند سیکنڈ کے لیے ہوا۔ اُس نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بڑی ڈھٹائی سے انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "چلیے یہ تو بہت اچھّا ہوا۔ اب آپ مُجھے پکڑ سکیں گے۔ لیجیے، بندرگاہ آ گئی۔"

بیس منٹ بعد حامد بِلّا کراچی کی بندرگاہ پر کسٹمز آفیسر کے سامنے کھڑا اپنا سامان چیک کرا رہا تھا۔ انسپکٹر سعید اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے کسٹمز آفیسر کو ایک خاص اشارہ کیا۔

"کیا میں جا سکتا ہوں؟" کسٹمز آفیسر سامان کی تلاشی لے چکا تو حامد بلّے نے مُسکرا کر کہا۔

"نہیں۔" آفیسر نے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ اس کمرے میں چلیے۔"

کمرے میں پہنچ کر حامد نے بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہنس کر بولا۔ "فرمائیے؟"

ابھی اُس نے اِتنا ہی کہا تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھلا اور انسپکٹر سعید اندر داخل ہوا۔ اُس نے آتے ہی دائیں ہاتھ سے حامد کو دبوچ لیا اور بائیں ہاتھ سے اُس کی بائیں آنکھ باہر نکال لی۔ وہ شیشے کی آنکھ تھی اور اُس کے اندر ایک بہت ہی قیمتی ہیرا رکھا ہوا تھا۔

"کمال ہے؟" حامد بلِے کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد کسٹمز آفیسر

حیرت سے بولا۔ "مُجھے تو ساری زندگی یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ شخص کانا ہے اور اِس کی ایک آنکھ شیشے کی ہے۔ انسپکٹر صاحب، آپ نے کیسے پتا چلا لیا؟"

"بھئی ہم پولیس والے ہیں۔ اُڑتی چڑیا کے پَر گِن لیتے ہیں۔" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔ "آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ شخص جب باتیں کرتا تھا تو صرف دائیں آنکھ ہی جھپکتا تھا۔ بائیں آنکھ کھلی رہتی تھی۔ میں نے غور کیا تو جھٹ سمجھ گیا کہ یہ آنکھ مصنُوعی ہے۔"

"واقعی واقعی۔" آفیسر سر ہلا کر بولا۔ "آپ اُڑتی چڑیا کے پَر گِن لیتے ہیں!"

(تعلیم و تربیت دسمبر ۱۹۹۰)
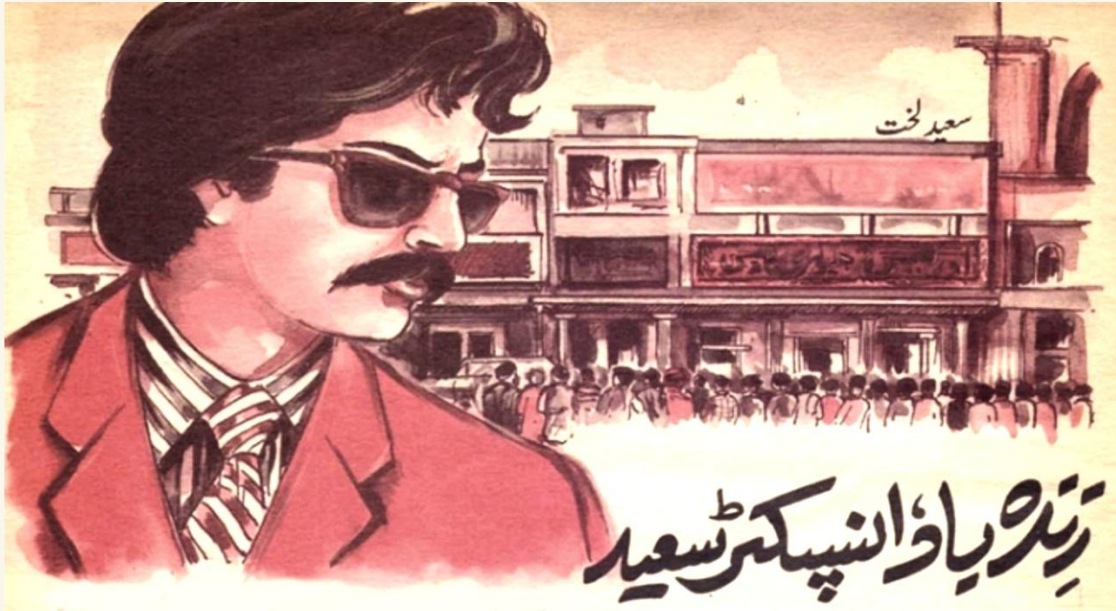
چوروں کے ایک گروہ نے صدر بازار کے ایک جوہری کی دُکان لُوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ اُنھوں نے تین چار دِن دُکان کی نگرانی کر کے یہ معلوم کیا کہ اُس میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں، مالک کہاں رہتا ہے اور کس وقت دُکان بند کر کے گھر جاتا ہے۔

اُنھیں معلوم ہوا کہ دُکان میں چار آدمی ملازم ہیں۔ مالک گلبرگ میں رہتا ہے اور رات کو آٹھ بجے دُکان بند کرتا ہے۔ اِن باتوں کا اُنھوں نے ایسی رازداری اور چالاکی سے پتا چلایا کہ کسی کو شُبہ تک نہ ہوا۔

ایک دِن شام کو دُکان کے مالک سیٹھ عزیز بٹ نے دُکان بند کی، نوکروں کو رُخصت کیا اور کار میں سوار ہو کر گھر روانہ ہو گیا۔ کُچھ فاصلے پر چور کار میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی کار اُس کے پیچھے لگا دی۔

جب سیٹھ عزیز کی کار نہر کے پاس پہنچی تو چوروں نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔ یہاں سڑک سُنسان تھی۔ اُنھوں نے سیٹھ کی کار کو اوور ٹیک کیا اور پھر اپنی کار اُس کی کار کے سامنے لا کر ایک دم بریک لگا دیے۔

سیٹھ صاحب اس اچانک واقعے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ چوروں نے کار میں سے نکل کر انھیں قابو میں کر لیا۔ ایک چور نے سیٹھ کی جیب میں سے دُکان کی چابیاں نکالیں اور اپنی کار میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو دے دیں۔ دوسرے چوروں نے جلدی جلدی سیٹھ کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُسے اُسی کار کی پچھلی سیٹ کے نیچے ڈال دیا۔ اِس کے بعد دونوں کاریں جدھر سے آئی تھیں، اُدھر ہی روانہ ہو گئیں۔

صدر پہنچ کر چوروں نے کاریں سیٹھ کی دُکان سے کُچھ فاصلے پر کھڑی کیں۔ ایک چور سیٹھ کی نگرانی کے لیے وہیں رُک گیا اور دوسرے چور تالا کھول کر سیٹھ کی دُکان میں داخل ہو گئے۔ سڑک پر خاصی ٹریفک تھی اور کُچھ دُکانیں بھی کھُلی ہوئی تھیں، مگر لوگوں نے اِس طرف کوئی توجّہ نہ دی۔ وہ سمجھے کہ سیٹھ اپنے ملازموں کے ساتھ کسی کام سے واپس آیا ہے۔

پندرہ منٹ بعد چور بڑے اطمینان سے دُکان سے باہر نکلے اور تالا لگا کر کار میں بیٹھ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جس میں قیمتی ہیرے اور جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ دونوں کاریں پھر وہیں واپس پہنچیں جہاں چوروں نے سیٹھ کو پکڑا تھا۔ اُنھوں نے سیٹھ کے ہاتھ پاؤں کھول دیے اور اُسے کار میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ سیٹھ صاحب بھاگم بھاگ تھانے پُہنچے اور ہانپ ہانپ کر اور کانپ کانپ کر ساری رام کہانی سُنائی۔ پولیس نے یہ کیس خُفیہ پولیس کی اُس برانچ کے سپُرد کیا جس کا انچارج

انسپکٹر سعید تھا۔ انسپکٹر نے سیٹھ سے شروع سے آخر تک ساری باتیں دریافت کیں۔ مگر سیٹھ صاحب سوائے اس کے کہ اُنھیں چند چوروں نے پکڑ کر چابیاں چھین لیں اور کُچھ نہ بتا سکے۔ دراصل یہ ساری واردات اتنی تیزی اور صفائی سے ہوئی تھی کہ وہ چوروں کی صورت دیکھنا تو کُجا، اُن کی آواز تک نہ سُن سکے تھے۔

انسپکٹر سمجھ گیا کہ اُسے بہت چالاک اور عیّار چوروں واسطہ پڑا ہے۔ اُس نے سیٹھ کی دُکان کا کونا کونا چھان مار مگر چوروں کی چھوڑی ہوئی کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے اُن کا کُچھ اتا پتا معلوم ہو سکتا۔ اُن تجوریوں اور شیلفوں پر بھی اُنگلیوں کے نشان نہ تھے جِن میں سے چوروں نے ہیرے جواہرات نکالے تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو وہ دستانے پہنے ہوئے تھے یا پھر جاتے وقت سارے نشانات کپڑے سے صاف کر گئے تھے۔

"ایسا مُشکل کیس مُجھے زندگی میں پہلی بار ملا ہے؟" انسپکٹر سوچ رہا تھا۔ "نہ

اُنگلیوں کے نشانات اور نہ چوروں کی کوئی شناخت معاملہ بہت ٹیڑھا ہے۔"

اِس واقعے کو کئی ہفتے گزر گئے اور چوروں کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔ انسپکٹر سعید اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا کہ اُن چوروں نے ایک اور واردات کی اور یہ واردات پہلی واردات سے زیادہ سنگین اور پیچیدہ تھی۔ انسپکٹر سعید جیسا خرانٹ پولیس افسر بھی چوروں کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

ہوا یوں کہ ٹھیک ایک مہینے بعد چوروں نے ایک اور جوہری سیٹھ عظیم بھائی بمبئی والا کی دُکان تاکی اور اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ مگر سیٹھ صاحب بہت تگڑے اور طاقت ور تھے اور چوروں کو معلوم ہوا کہ وہ ہر وقت اپنے پاس ریوالور رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن پر پہلی والی ترکیب استعمال کرنا مُشکل تھا۔ اِس کے لیے انھوں نے دوسری ترکیب سوچی۔

اِن چوروں میں سے ایک شخص بڑا ماہر نقب زن تھا۔ سیٹھ عظیم کی دُکان کی چابی اُڑانے کا کام اُس نے اپنے ذمّے لیا۔ وہ رات کو سیٹھ کی کوٹھی کے پاس چھُپ کر کھڑا ہو جاتا اور سیٹھ کے گھر آنے اور گھر والوں کے سونے کا وقت نوٹ کرلیتا۔ اُس نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ سیٹھ اوپر کی منزل کے کس کمرے میں سوتا ہے اور کوٹھی میں کوئی کُتّا نہیں ہے۔

یہ باتیں دریافت کر کے وہ چوتھے روز رات کو دو بجے کوٹھی میں داخل ہو گیا اور اِدھر اُدھر پھر کر اوپر چڑھنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ اچانک اُس کی نظر اوپر کی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی پر پڑی جو کھُلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی ٹین کا پرنالا تھا جو چھت سے نیچے زمین پر آتا تھا۔

چور پرنالے پر چڑھ گیا اور بندر کی طرح اُچکتا ہوا کھڑکی کے پاس جا پہنچا۔ یہاں وہ ایک منٹ کے لیے رُکا اور کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں اُسے دو پلنگ نظر

آئے۔ ایک پلنگ پر سیٹھ سو رہا تھا اور دوسرے پر اُس کی بیوی۔ چور کی خُوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے آہستہ سے مُمّٹی پر پاؤں رکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ کمرے کے اندر تھا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ سیٹھ چابیاں کہاں رکھتا ہو گا۔ میز کی دراز میں یا کسی الماری میں۔ سامنے کپڑوں کی الماری تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ پہلے سیٹھ کے کپڑوں کی تلاشی لی جائے۔ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا الماری کے پاس پہنچا۔ الماری کا پٹ بے آواز کھل گیا۔ اندر بہت سے سوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے کوٹوں کی جیبوں کو ٹٹولا اور آخر ایک کوٹ کی جیب میں سے چابیوں کا گُچھّا مل گیا۔ چابیاں لے کر وہ جس طرح اوپر چڑھا تھا، اُسی طرح نیچے اُتر گیا۔ کُچھ فاصلے پر اُس کے ساتھی کار میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس کے بیٹھتے ہی کار ہوا ہو گئی۔ اُس کا رُخ صدر بازار کی طرف تھا۔

صدر پہنچ کر چوروں نے سیٹھ کی دُکان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر کار

کھڑی کی اور بڑی ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دُکان کی طرف بڑھے۔ آس پاس کوئی چوکیدار نہ تھا اور نہ پولیس کی گشتی پارٹی ہی کہیں دکھائی دیتی تھی۔ وہ دُکان کا تالا کھول کر اندر گھسے، تجوریوں اور شیلفوں سے قیمتی ہیرے جواہرات سمیٹے پھر دُکان کا تالا لگا کر دوبارہ سیٹھ کی کوٹھی پہنچے۔ وہ چور اُسی پرنالے کے ذریعے اوپر چڑھا، کوٹ کی جیب میں چابیوں کا گُچھّا رکھا اور پھر نیچے اُتر آیا۔

دوسرے دِن سیٹھ عظیم بھائی بمبئی والا اپنی دُکان پر پُہنچے تو باہر سے سب کُچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ تالا کھول کر اندر داخل ہوئے۔ اتنے میں نوکر چاکر بھی آ گئے۔ اچانک سیٹھ کی نظر اُس شیلف پر پڑی جس میں ہیرے کا ایک نہایت قیمتی ہار رکھا ہوا تھا۔ ہار وہاں سے غائب تھا۔ سیٹھ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے گھبرا کر دوسرے شیلف اور تجوریاں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ کم سے کم پچاس ساٹھ لاکھ روپے کا مال غائب ہے۔

اُس نے فوراً ہی پولیس کو ٹیلی فون کیا۔

ایک بار پھر چور پولیس کو چکما دینے میں کام یاب ہو گئے تھے۔ انسپکٹر سعید کو دُکان میں ایک بھی چیز ایسی نہیں ملی جس سے چوروں کو پکڑنے میں مدد ملتی۔ شیلفوں اور تجوریوں پر سے وہ انگلیوں کے نشانات بھی صاف کر گئے تھے۔ انسپکٹر نے ایک گھنٹے دُکان کا معائینہ کیا اور نوکروں سے پوچھ کُچھ کر کے واپس آ گیا۔

دوسرے دِن اُس نے اپنے ماتحت سُراغ رسانوں کی میٹنگ بلائی، مگر ایک گھنٹے کی مغز کھپائی کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور بولا:

"ایسے چالاک اور عیّار چوروں سے زندگی میں پہلی بار میرا پالا پڑا ہے۔ چور اور ڈاکو اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسا سُراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں جن سے اُن کا کھوج لگانے میں مدد ملتی ہے۔ مگر یہ کم بخت اتنے ہوشیار ہیں کہ انگلیوں

کے نشانات تک صاف کر جاتے ہیں، کوئی چیز چھوڑنا تو بڑی بات ہے۔ انہیں گرفتار کرنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔"

"وہ کیا؟" ایک سُراغ رساں نے پوچھا۔

"ہمیں بھُوتوں کی ٹولی سے مدد لینی پڑے گی۔"

"بھُوت" خُفیہ پولیس کے وہ لوگ ہیں جو چور اُچکّوں میں مل جُل کر رہتے ہیں۔ اُنہیں چوروں، جیب کُتروں اور بد معاشوں کے ٹھکانے کا پتا ہوتا ہے اور وہ اُن کی سرگرمیوں سے پولیس کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ انسپکٹر نے "بھُوتوں" کے سردار کو بُلایا اور اُسے ہیرے چور گروہ کا سُراغ لگانے کا حُکم دیا۔

کئی ہفتے گزر گئے مگر چوروں کے متعلّق کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ انسپکٹر سعید مایوس ہو چلا تھا کہ ایک دِن اُسے کسی نے فون کیا۔ یہ بھُوتوں کی ٹولی

کا سرِ دار تھا۔ اُس نے انسپکٹر کو بتایا کہ میں نے ایک ایسے شخص کا سُراغ لگایا ہے جو اُن چوروں کے بارے میں بہت کُچھ جانتا ہے۔ اُس کا نام اختر کھبّا ہے اور وہ حال ہی میں جیل سے رہا ہو کر آیا ہے۔ وہ شخص گناہ کی زندگی سے تنگ آ گیا ہے اور اب ایک پُر امن اور شریف شہری کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ لیکن اُس کے ساتھی اُسے ایسا نہیں کرنے دیتے۔ وہ اُسے دھمکیاں دیتے ہیں کہ اگر تُم نے ہمارا ساتھ چھوڑا تو ہم تمہیں جان سے مار دیں گے۔

"ٹھیک ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "تم اُسے میرے پاس لے آؤ۔ اُس سے کہنا کہ پولیس تمہاری حفاظت کا ذمہ لیتی ہے۔"

اُسی دِن شام کو اختر کھبّا پولیس کی بند گاڑی میں انسپکٹر سعید کے دفتر پہنچ گیا۔ اُسے چوروں کے نام اور پتے معلوم نہ تھے۔ لیکن اُس مکان کا پتا تھا جہاں چرائے ہوئے ہیرے اور جواہرات چھپائے گئے تھے۔ یہ مکان

شہر سے بیس میل دُور ایک گاؤں میں تھا۔

دوسرے دِن سورج نکلنے سے پہلے ہی انسپکٹر پولیس کا دستہ لے کر اُس گاؤں میں جا پہنچا اور مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مکان کے اندر صرف ایک شخص تھا جسے پولیس نے ڈرایا دھمکایا تو اس نے وہ جگہ بتا دی جہاں ہیرے جواہرات چھپائے گئے تھے۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کے نام اور پتے بھی بتا دیے۔ انسپکٹر نے حوالدار کو تین چار کانسٹیبل دے کر دوسرے چوروں کو پکڑنے کے لیے بھیجا اور خود چوری کا مال لے کر اپنے دفتر آ گیا۔ دوپہر سے پہلے پہلے چور پکڑ لیے گئے۔

(تعلیم و تربیت جنوری ۱۹۹۱)